تقدیم

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

رسالہ اجتہاد کے پہلے شمارے کو جو پذیرائی ملی ہے، اس سے ہمارا یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ پاکستانی معاشرہ مذہبی تنگ نظری، فرقہ واریت، انتہا پسندی اور باہمی منافرت کے رویوں سے تنگ آ چکا ہے۔ دینی مسائل پر کھل کر بات چیت کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ عوام شرعی اور دینی مسائل پر بحث میں شریک رہنا چاہتے ہیں۔ اسلامی قانون سازی کے عمل میں وسیع تر مشاورت کا احساس جاگ رہا ہے۔ فقہی مسائل میں اختلاف رائے ملک و دین کے لیے خطرہ نہیں بلکہ اتفاق رائے کے حصول کی جانب پہلا قدم سمجھا جا رہا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی اس پالیسی کو بھی سراہا گیا ہے کہ وہ اپنی آراء و سفارشات کو نوکر شاہی کی صیغہ راز کی پالیسی ترک کر کے سرخ فیتوں میں بند فائلوں سے نکال کر ذرائع ابلاغ کی کھلی فضا میں لے آئی ہے۔ اسے ماہرین کی اجارہ داری سے نکال کر عام قارئین کی آراء کے لیے دستیاب کر دیا ہے۔ اس سے لوگوں میں یہ اعتماد پیدا ہوا ہے کہ اسلامی قانون آج کے انسان کے مسائل میں دلچسپی لیتا ہے اور ان مسائل کے حل میں عوام کی رائے کو اہمیت بھی دیتا ہے۔

کونسل کی آراء جس طرح موضوع بحث رہیں، وہ نہایت خوش آئند پیش رفت ہے۔ اخبارات میں، ٹیلی وژن پر، رسائل اور مختلف کتابوں میں کونسل کی سفارشات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان سے اتفاق بھی کیا گیا، اختلاف بھی۔ تنقید بھی ہوئی اور تعریف بھی۔ بعض اداروں، کالم نگاروں، مصنفین اور مقررین نے تند و تیز مذمتی لہجہ بھی اختیار کیا اور شدید اختلاف بھی کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی خفگی بھی کونسل سے خیر خواہی اور دینی حمیت کے جذبے پر مبنی تھی۔ ہم ان سب کے شکر گذار ہیں کہ یوں ان مسائل پر عام گفتگو کا آغاز تو ہوا۔ سننے اور سنانے کی روایت پھر سے شروع تو ہوئی۔ ہمیں خوشی اس لیے بھی ہے کہ یہ اسلام کی ایک علمی اور دینی روایت کا احیا ہے کیونکہ دین نصیحت اور خیر خواہی کا نام ہے اور اختلاف قومی مفاہمت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے جو بھی مسائل آتے ہیں، ان پر کھل کر بحث ہوتی ہے۔ اختلاف رائے بھی سامنے آتا ہے۔ تاہم کوشش ہوتی ہے کہ کونسل کی سفارش اتفاق رائے سے تشکیل پائے۔ الحمد للہ کونسل کی اکثر سفارشات اتفاق رائے پر مبنی ہیں۔ البتہ کوششوں کے باوجود بعض اوقات اتفاق رائے نہیں ہو پاتا تو کثرت رائے سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ چند مواقع ایسے بھی آئے جہاں، بعض ارکان نے یہ سوال اٹھایا کہ قرآن و سنت کے حوالے سے فیصلے کثرت رائے کی بنا پر کیسے کیے جا سکتے ہیں؟ یہ خدشہ بہت اہم ہے لیکن یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب یہ اصرار ہو کہ قرآن و سنت کی صرف ایک تعبیر ممکن ہے۔ فقہ اسلامی کی تاریخ میں اکثر مواقع پر علماء و فقہاء میں قرآن و سنت کی تعبیر میں اختلاف رہا ہے لیکن اس اختلاف کو امت کے لیے رحمت سمجھا گیا۔ فقہی مذاہب کا ظہور اسی اختلاف کا نتیجہ ہے۔ آج بھی دنیائے اسلام میں نو فقہی مذاہب موجود ہیں۔ ان کے بارے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں، ان میں سے کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ حال ہی میں ایک بین الاسلامی کانفرنس میں جو ۴-۶ مئی ۲۰۰۵ء کو عمان (اردن) میں منعقد ہوئی اور جس میں شیخ الازہر، آیت اللہ سیستانی، مفتی دیار مصر، مفتی عمان، مفتی اردن، مفتی مؤتمر اسلامی اور شیخ یوسف القرضاوی کے علاوہ عالم اسلام کے بہت سے مفتی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں یہ کہا گیا کہ تمام مذاہب، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، جعفری، زیدی، اباضی، ظاہری، سلفی، اشعری اور صوفی حق پر ہیں اور ان میں سے کسی کی تکفیر جائز نہیں۔ (اسلام اور دہشت گردی، مطبوعہ اسلامی نظریاتی کونسل، ۲۰۰۵، ص ۲۶)۔

تعبیر کے اس اختلاف کی بنیاد تمام مذاہب کا اس بات پر اجماع ہے کہ فقہ کے اولین مآخذ قرآن و سنت ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر اماموں کی واضح ہدایات موجود ہیں کہ اگر ان کی کوئی رائے قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔ تاہم تقلید کے ادوار میں یہ ذہن بنتا گیا کہ قرآن کی کوئی آیت اگر فقہی رائے کے خلاف ہو تو آیت منسوخ ہو گی یا اس کی تاویل موجود ہو گی۔ سنت اور احادیث کے بارے میں بھی فقہی مذاہب میں اختلاف موجود رہا۔ احادیث کے اصول میں بھی اور احادیث کے قبول میں بھی۔ اسی اختلاف کے پیش نظر احادیث کی چھان پھٹک اور ان کے مجموعے تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ مجموعے بہت محنت اور عرق ریزی سے تیار کیے گئے تھے، لیکن ان سے احادیث کے بارے میں اختلاف کم تو ہوا مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔

اول تو شیعہ اور سنی مذاہب کے صحیح احادیث کے معیار اور مجموعوں میں فرق ہے۔ سنی مذاہب کے نزدیک صحیح احادیث کے چھ مجموعے ہیں۔ تاہم سنی بھی یہ مانتے ہیں کہ احادیث کے اور مجموعے بھی موجود ہیں، جو اس کڑے معیار پر مبنی نہیں ہیں، جو چھ مجموعوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث کے مجموعے شیعہ محدثین نے بھی مرتب کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان صحیح مجموعوں کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ فقہی مذاہب نے صرف انہی احادیث پر انحصار کیا ہو جو ان مجموعوں میں درج ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان احادیث کے مجموعوں میں بھی اگر اختلاف ہے تو فروع میں ہے، اصول میں نہیں۔

المیہ یہ ہے کہ تقلید کے دور میں یہ ذہن بنتا گیا کہ اصول میں ہی نہیں فروع میں بھی فقہی مذاہب اور ان کی آراء ہی قرآن وسنت کے قبول کا معیار ہیں۔ قرآن وسنت کی تعبیر براہ راست نہیں بلکہ ان فقہی آراء کی بنیاد پر کی جانی ضروری ہے۔ ملت کی یک جہتی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ فقہی مذاہب سے اختلاف کو سختی سے روکا جائے تاکہ امت مسلمہ تفرقے کا شکار نہ ہو۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے دوسرے دو اصولوں یعنی قیاس اور اجماع کو بھی اسی زاویے سے دیکھا جانے لگا۔ قیاس اور اجماع دونوں کو فقہی آراء میں محصور کر دیا گیا۔ اجماع ایک عملی اصول تھا اور ابتداً میں اس سے کسی مسئلہ پر غور وخوض کے بعد اتفاق رائے مراد تھا۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مکتب فقہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو امام کے شاگرد فقہاء کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ان شرکاء کی تعداد چالیس کے قریب بتائی جاتی ہے اور ان کے اتفاق رائے کو تحریر میں لایا جاتا تھا۔ اب اجماع فقہی مذہب کا دوسرا نام بن گیا۔ اس خیال سے کہ فقہی مذاہب اتفاق رائے سے وجود میں آئے تھے اور ایک عرصہ سے لوگ ان کی پابندی کر رہے ہیں، فقہی مذاہب کو ہی اجماع قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ فقہ کی کوئی بھی کتاب ایسی نہیں، جو مختلف مسائل میں امام مذہب اور اس کے شاگردوں کے مابین اختلاف رائے کا ذکر نہ کرتی ہو۔ پھر ایک دور یہ آیا کہ فقہاء کے اس اجماع کو اجماع امت کا نام بھی دے دیا گیا۔ حالانکہ اصول فقہ کی کتابوں میں اجماع صرف فقہاء اور علماء کے اتفاق کا نام نہیں۔ اس کی تعریف میں اہل الرائے اور اہل شوکت کا نام بھی آتا ہے۔ اجماع کا عملی پہلو یہ تھا کہ صحیح معنوں میں اجماع کبھی بھی مکمل اتفاق رائے کا نام کبھی نہیں رہا۔ کسی مسئلہ پر کسی نہ کسی فقیہ یا عالم کا اختلاف ضرور موجود رہا۔ چنانچہ اجماع درحقیقت اس کثرت رائے کا نام ہے، جسے قبول عام حاصل ہو جائے۔

اجماع کو ایک عمل اور ادارے کی شکل دینے کی بجائے فقہی مذاہب تک محدود کرنے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک یہ اندیشہ تھا کہ رائے کی آزادی اور اختلاف سے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برصغیر دوسرے مسلم علاقوں کی نسبت سیاسی، معاشی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا۔ تاتاریوں کی تاخت وتاراج سے سب سے زیادہ وہ علاقے متاثر ہوئے، جہاں حنفی مذاہب کے پیروکار بستے تھے تاہم برصغیر تاتاری اثرات سے محفوظ رہا۔ وسط ایشیا میں اور شام وعراق میں تاتاری حملوں کے بعد بہت سی تبدیلیاں آئیں، جن کے زیر اثر حنفی فقہ میں نئے رجحانات اور نئے مدارس کا ظہور ہوا۔ مشائخ بلخ وبخارا کا ذکر برصغیر کی فقہ کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ حنفی مشائخ بلخ وبخارا کی فقہی آراء مشائخ شام سے مختلف تھیں، کیونکہ دونوں علاقوں کے معروضی حالات میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ میں حنفی فقہاء جس طرح ریاست کے نظام کا حصہ بنے وہ صورت برصغیر میں ظہور پذیر نہیں ہو سکی۔ مغلیہ نظام سلطنت میں گاہے گاہے ہی فقہاء کو یہ حیثیت مل سکی۔ انتظامی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں سے عام طور پر فقہاء کا براہ راست واسطہ نہیں رہا۔ ان تاریخی عوامل کا نتیجہ تھا کہ تقلیدی رویے برصغیر میں زیادہ پختہ رہے۔ چنانچہ یہاں فقہی مذاہب کو ہی اجماع امت کا قائم مقام سمجھا گیا اور علماء اجتہاد کی بجائے حفاظت دین کے قائل رہے۔

انیسویں صدی میں برطانوی استعمار کے دور میں بھی علماء نے حفاظت دین کو ضروری سمجھا، اس دفاعی رویے نے بھی تقلید مذہب میں عافیت سمجھی۔ تاہم بیسویں صدی میں دور جدید کے مسائل کا سامنا ہوا اور افتاء کے ادارے نے یہ ذمہ داریاں سنبھالیں تو یہ تقلیدی رویہ قائم نہ رہ سکا۔ اکثر مسائل اتنے نئے تھے کہ فقہی سرمایے میں رہنمائی نہ ملتی تھی اور تقلید ممکن نہیں تھی۔ برصغیر نے شاہ عبدالعزیز، نواب صدیق حسن خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خان، مفتی کفایت اللہ، مولانا علی نقی نقوی عرف نقن میاں، مفتی میر عباس، مفتی احمد علی اور مولانا سید نذیر حسین جیسے نامور مفتی پیدا کیے۔ فتاویٰ کا ایک عظیم ادب تخلیق ہوا۔ افتاء کے اداروں کو فروغ ہوا، فتویٰ کا معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں سے براہ راست تعلق تھا۔ اس دور میں کئی اہم باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو سائنسی اور تکنیکی مسائل میں نئے علوم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فقہاء نے ان علوم کے ماہرین سے مشاورت کی روایت کا آغاز کیا۔ دوسرے فتاویٰ میں مختلف فقہی مذاہب کی آراء سے استفادے اور ان پر مبنی فیصلوں کا رواج ہوا۔ اس کی ایک عمدہ مثال مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ ''الحیلۃ الناجزۃ'' ہے، جس میں انہوں نے مالکی مذہب کی فقہی آراء کو اختیار کر کے برصغیر میں مسلم خواتین کے لیے عدالت کے ذریعے تنسیخ نکاح کے حق کی تائید کی۔ تیسرے ان فتاویٰ میں اب صرف فقہی مذہب کی مخصوص آراء ہی نقل نہیں کی جاتیں بلکہ براہ راست قرآن وسنت کے حوالے اور ان سے استنباط بھی کیا جاتا ہے۔ چوتھے، فتاویٰ نے اس ضرورت کے احساس کو اجاگر کیا کہ عام مسلمان کو بھی افتاء کے عمل میں شریک سمجھا جائے، اس لیے جدید فتاویٰ صرف ہاں یا نہیں میں جواب نہیں دیتے بلکہ پوری تفصیل سے مفتی کا موقف بیان کرتے ہیں تاکہ قاری صرف مفتی کے کہنے پر نہیں بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ اس فتویٰ پر عمل کر سکے۔

دور جدید نے بہت سے نئے مسائل کو جنم دیا ہے اور بہت سے پرانے مسائل کو نئے سیاق وسباق میں پیش کیا ہے۔ اسلامی قانون کے نئے افق سامنے آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بہت اہم افق اسلام اور مغرب کا حوالہ ہے، جو اس تازہ شمارے کا

موضوع ہے۔ ایک لحاظ سے یہ حوالہ اس تبدیلی کا تسلسل ہے، جس کا آغاز دورِ استعمار میں ہوا اور اب یہ افق بہت وسیع ہوگیا ہے، کیونکہ اس سے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، معاشی، قانونی اور ثقافتی پہلو ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس نے اسلامی تہذیب وثقافت کو نئے علمی افق بھی مہیا کیے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کو احساس ہے کہ امت مسلمہ پر، جسے قرآن نے تمام انسانیت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تقلید کی تنگ نظری ختم کر کے اجتہاد کا راستہ اختیار کرے اور یوں قرآن وسنت کی روشنی کو عام کرے اور اس مقام شہادت کا حق ادا کرے، جس پر اسے فائز کیا گیا ہے۔ اگر حفاظت دین کے تقلیدی اور قدامت پسندانہ رویے پر اصرار جاری رہا تو امت مسلمہ انتہا پسندی کا شکار ہو کر تنہا ہوتی چلی جائے گی اور انسانیت دین بیزاری کے راستے پر بہت دور نکل جائے گی۔

اس شمارے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین رابطوں کا جو نیا رخ سامنے آیا ہے، اسے بہتر طریقے سے سمجھا جاسکے تاکہ امت مسلمہ خصوصاً پاکستان اس میں اپنا صحیح کردار ادا کرسکے۔ اس نئے رابطہ میں اسلام اور مغرب کے الفاظ دین، ثقافت اور فکر کے نمائندہ ہیں اور صرف دین اور مذہب تک محدود نہیں۔ دوسرے اسلام اور مغرب کے رابطوں میں نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ جہاں مغرب میں اسلام اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے، وہاں اسلام بھی مغرب سے نامانوس نہیں۔ اس دور میں جہاں مغربی دانشوروں نے اسلام کو خطرہ قرار دیتے ہوئے، اسلام اور مغرب کے مابین تصادم کی چیخ وپکار سے، اسلام اور مغرب میں منافرت پھیلانے کی کوشش کی ہے، وہاں بعض مسلمانوں نے بھی مغرب کے خلاف دہائی دے رکھی ہے۔ اس صورت حال نے اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کردیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے، اس عالمی دور نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے فکری، دینی اور ثقافتی پیغام کو انسانیت کے مشترکہ سرمایہ کے طور پر پیش کریں اور مغرب جو روز بروز دین کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار سے بھی بیزار ہوتا نظر آرہا ہے، اسے اسلام کی انسانی اقدار کی دعوت دیں۔

اس دعوت کے لیے قدیم علم الکلام کام نہیں دے گا۔ قدیم علم الکلام بنیادی طور پر مناظرانہ اور اعتذاری ہے۔ اب ایک جدید علم الکلام کی ضرورت ہے، سرسید نے اس جدید علم الکلام کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی اور اپنی کئی تصنیفات کے ذریعے اس کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔ سرسید، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے مکتب فکر کے تربیت یافتہ تھے، جہاں اختلافات کو گفت وشنید اور مکالمہ سے سلجھانے کی روایت تھی۔ شاہ عبدالعزیز کے عہد تک فوجی فتوحات کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران برصغیر کی اسلامی علمی روایت سے مرعوب تھے۔ کمپنی کی انتظامیہ کے افسران شاہ صاحب کی مجالس میں شریک ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں انگریز اردو، عربی اور فارسی زبانیں سیکھنے کے ساتھ مقامی ادب میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ایسے انگریزی شعراً کی تعداد جو اردو میں غزل کہتے تھے، سینکڑوں میں ہے۔ لکھنؤ میں بہت سے انگریزوں نے مغل بود وباش اختیار کر رکھی تھی۔ قدامت پسند مسلمان انگریزی زبان، انگریزی لباس اور انگریزوں کی نوکری اور دوسرے بہت سے مسائل میں تحفظات کا اظہار ضرور کرتے تھے، لیکن انگریزوں سے مرعوبیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ دینی ثقافت اور مذہب سے وابستگی کی بنا پر، ۱۸۵۷ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور استعمار نے جبر اور استبداد کی راہ اختیار کی، تو مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اختلافات اور نفرت کی خلیج پیدا ہوگئی۔ استعمار نے اپنی برتری کے لیے اسلحہ اور فوج کے ساتھ علمی اور تبلیغی حملوں کا سلسلہ بھی شروع کیا، مناظرے اور جلسے شروع ہوئے، لیکن قدیم علم الکلام جدل اور مناظرے سے آگے نہ بڑھ سکا۔

سرسید نے جدید علم الکلام کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ مغرب سے مکالمے کے لیے مغرب کی زبان اور فکر سے واقفیت ضروری تھی۔ مغرب کی طاقت کا سرچشمہ سائنس اور ٹیکنالوجی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کو نئے علوم سیکھنے کی دعوت دی۔ لیکن یہ دعوت شک وشبے کی نظر سے دیکھی گئی، یہ سمجھا گیا کہ سائنسی علوم کی تدریس سے مغربی استعمار مستحکم ہوگا۔ سرسید کے ساتھیوں میں بعض نے ساتھ دیا اور اس جدید علم الکلام کو آگے بڑھایا، لیکن بعض نے اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ علامہ شبلی نعمانی ان لوگوں میں سے تھے، جن کا کہنا تھا کہ مغرب سے مکالمے کے لیے قدیم علم الکلام کافی ہے، جدید علم الکلام کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر علماء کا بھی یہی موقف تھا چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے حضرات نے سرسید کے جدید علم الکلام پر کڑی تنقید کی اور اسے اسلامی تعلیمات سے متصادم ٹھہرایا۔ حالات بدلتے گئے اور علم الکلام کے تقاضے اور اہداف بھی بدلتے گئے، مختلف اہل علم نے علم الکلام کی اس پیش رفت میں حصہ لیا، لیکن ان کوششوں میں سب سے اہم اور نمایاں کام علامہ اقبال کا ہے۔ انہوں نے جدید علم الکلام میں اصول فقہ اور اجتہاد کو شامل کیا، مغربی فکر کا آزادانہ اور ناقدانہ مطالعہ ضروری قرار دیا اور یوں ایک وسیع اور جدید علم الکلام کی ابتداً کی، علامہ اقبال کی ان کوششوں نے علم الکلام کی بہت سی نئی جہتوں کو واضح کیا۔ روایتی علم الکلام مابعد الطبیعات اور علم العقائد تک محدود تھا۔ جدید علم الکلام سائنس، سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، سماجیات، لسانیات اور دیگر علوم کی وسعت کو ساتھ لے کر آیا ہے۔

اسلام اور مغرب کے روابط نے اس جدید علم الکلام کو بہت سے مزید نئے افق دیئے ہیں، جو اسلامی دنیا کے دانشوروں کی توجہات کا موضوع بنے۔ آج ایران، مصر، مراکش، ملائیشیاء، لبنان، انڈونیشیا، بھارت، اور یورپ میں ان موضوعات پر کتابیں لکھی جارہی ہیں، مذاکرے ہورہے ہیں، رسالہ اجتہاد کے موجودہ شمارے کا موضوع ''اسلام اور مغرب''، ہے، ارادہ ہے کہ آئندہ شمارے کا موضوع جدید علم الکلام ہوگا۔ ہماری کوشش ہے کہ اس رسالے کے ذریعے ہم ان علمی مباحث و مذاکرات سے آگاہی فراہم کرکے، اسلام کی اجتہادی روایت سے قارئین کا رابطہ جاری رکھ سکیں۔